معاشرتی تغیر اور سنت اولی

ڈاکٹر فضل الرحمن

جب کسی معاشرے میں نئی سماجی اقتصادی، اخلاقی ثقافتی یا سیاسی قوتیں بڑے پیمانے پر در انداز ہوتی ہیں تو اس معاشرے کی بقا کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ جدید تقاضوں سے کس حد تک تعمیری انداز سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اگر معاشرہ افراط و تفریط سے بچ سکے' یعنی نہ تو وہ سراسیمہ ہوکر اپنی ذات میں محصور ہو اور ماضی میں دل بہلانے والی پناہ گاہیں تلاش کرے اور نہ دوسری انتہا پر اپنے ہی نصب العینوں کو نئے تقاضوں کی بھینٹ چڑھادے' تو وہ معاشرہ خود اعتمادی کے ساتھ مثبت تخلیقی صلاحیت کی مختلف شکلوں — حسب ضرورت انجذاب، ترک و اختیار — کو بروئے کار لاکر نئے تقاضوں کا سامنا کر سکے گا۔ وہ اپنی داخلی امنگوں کے لئے ایک نیا ذریعہ' اظہار فراہم کرسکے گا اور اپنے نصب العینوں کو نئے معنی و مفہوم پہنا سکے گا۔ لیکن اگر معاشرہ خود اپنی مرضی سے یا حالات کے دباؤ کے تحت مؤخرالذکر انتہا کو قبول کرلیتا ہے اور نئی قوتوں کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے تو اس کی بالکل قلب ماہیت ہوجائے گی۔ اور اس کا وجود حتماً وہ نہیں رہے گا جو پہلے تھا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس تغیر کے عمل میں اس کا وجود ہی سرے سے ختم ہوجائے۔ اور کوئی نیا معاشرتی ثقافتی نظام اس کو اپنے میں مکمل طور پر مدغم کرلے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اول الذکر لغزش اس سے کہیں زیادہ مہلک ہوگی۔ اگر معاشرہ اپنے ماضی میں رہنے لگے (خواہ ماضی کی یادیں کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں) ۔ اور حال کی حقیقتوں کا کھلے طور پر سامنا کرنے میں ناکام رہے (خواہ یہ حقیقتیں کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہوں)

تو لا محالہ وہ جامد اور متحجر بن جائے گا اور یہ غیر متبدل سنت الہی ہے کہ جامد و متحجر دیر پا نہیں ہوتے ۔

وما ظلمنھم ولکن ظلموا انفسھم

(القرآن : ھود)

''ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا''
(۱۱ : ۱۰۲)

تقریباً ایک صدی سے مسلمان معاشرے کی بنیادوں پر '' تجدد پسندی '' سے پیدا شدہ بے شمار قوتوں کا' جن کا سر چشمہ آج مغرب ہے' کی یلغار ہو رہی ہے۔ بر صغیر ہند و پاک اور مشرق وسطی کے مسلم مفکرین کی طرف سے' خاص طور سے گذشتہ صدی کے آخر میں' تعمیری انجذاب اور تطبیق کے ذریعے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی بعض شعوری کوششیں کی گئی ہیں اور پچھلے دس بیس سالوں میں جوں جوں مسلمان ملک اجنبی استعماری اقتدار سے آزاد ہوئے تو ان میں تجدد پسندی کے اثرات '' فطری طور '' پر تیز سے تیز تر ہو گئے ہیں۔ '' فطری طور '' پر اس لئے کہ ان ممالک میں قدرتی اور انسانی امکانی ذرائع میں اضافہ کی قطعی جائز خواہش کے تحت وسیع پیمانے پر اقتصادی پیداوار' حرکت' عوامی تعلیم' عوامی رسل و رسائل کے ذرائع کا حصول ایسی ضرورت ہے جس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں ۔ مسلم معاشرہ صنعتی دور میں داخل ہو چکا ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی بقا ممکن نہیں تھی ۔ اب اگر معاشرہ اسلامی رہتے ہوئے ترقی کرنا چاہتا ہے تو ان وسیع اور زبردست اثرات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اتنے ہی بڑے پیمانے کی تعمیری کوششیں ہونی چاہئیں ۔ یہ صورت حال شدید' واضح' منظم اور مترتب فکر کے بے باک عمل کی متقاضی ہے جو ابھی امت مسلمہ میں نظر نہیں آتا ۔ کم و بیش ہم سب ذہنی تساہل کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور پر ہم انہی' مذکورہ بالا دو انتہاؤں میں مبتلا ہیں جو اس تساہل سے پیدا ہوتی ہیں ۔ یعنی

(ا) نئی قوتوں کے مقابلے میں عدم مداخلت کا انداز' جس سے پایان کار نئی قوتوں کے بہاؤ میں بہہ جاتے ہیں ۔

(۲) ماضی کی طرف فرار کا رجحان جو بظاہر فوری طور پر جذباتی تسکین تو دیتا ہے لیکن حقیقتاً وہ ان دونوں میں زیادہ مہلک اور خطرناک رجحان ہے -

خوش قسمتی سے ہمیں صدر اسلام کی تاریخ میں بڑے قوی رہنما خطوط عمل ملتے ہیں جب کہ امت مسلمہ نے معاشرے کے نئے عوامل اور اثرات کا سامنا کرنے کے لئے قرآنی تعلیمات اور سنت نبوی (اعمال نبوی کی مثالی میراث) کی تعمیری تعبیر و تشریح کو '' سنت جاریہ '' میں داخل کیا - اس مجلہ کے کے صفحات پر ہم کسی حد تک تفصیل کے ساتھ '' سنت جاریہ '' کے متحرک اور ترقی پذیر مظاہر کا خاکہ پیش کرچکے ہیں - (۱) یہ محض علم کا ایک مظاہرہ نہ تھا جو تاریخی تجسس سے پیدا ہوا - اگر یہ تاریخی طور پر صحیح ہے تو اس میں ہمارے لئے اب بھی معانی ہیں اور یقیناً آئندہ بھی رہیں گے -

آئندہ سطور میں ہم مثالوں سے صدر اسلام میں اس ابتدائی سنت جاریہ کے ارتقا کا جائزہ لیں گے - ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہر مسئلے کا واقعاتی پس منظر اور '' شان نزول '' پیش کریں یعنی ان قوتوں کا جائزہ لیں جو ایک مخصوص اقدام کی داعی ہوئیں - اس ضمن میں پیش آمدہ مسائل میں جس حد تک جدت سے کام لیا گیا، اس کی نشان دھی کرکے ہم اس کی صحیح اہمیت واضح کریں گے - ان مثالوں میں مندرجہ ذیل تین پہلو قابل لحاظ ہیں -

۱- ان سے سنت جاریہ کے حقیقی مفہوم کی مکمل وضاحت ہوتی ہے -

۲- وہ مستقبل کی ترقیوں کے لئے رہنمائی کرتی ہیں -

۳- ان کے ذریعے علما سے یہ مؤدبانہ گذارش کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ تاریخی نقد کے اصولوں سے کام لیتے ہوئے تاریخی عمرانیاتی پس منظر میں حدیث کے ان ابتدائی ذخائر کا تعمیری مقاصد کے تحت مطالعہ کریں تو ان میں یقیناً نئے معانی ملیں گے - مثلاً المؤطا کی ایک حدیث یہ کہتی ہے کہ حضرت عمر نے ایسا ایسا کیا - اگر اسے صرف ایک حدیث یعنی محض ایک الگ تھلگ

۱ - تفصیل کے لئے دیکھیے ''فکر و نظر'' ، جلد اول، شمارہ جات ۱ — ۸

اور ماحول سے بے تعلق واقعہ کی خبر سمجھ کر پڑھا جائے تو وہ بے مقصد رہتی ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر ان عمرانی عوامل کے، جو اس واقعہ کے محرک ہوئے، کے پس منظر کے پورے شعور کے ساتھ اس کو سمجھا جائے تو وہ آج کے زمانے میں بھی با معنی نظر آتی ہے ۔ اور اس سے بالکل نیا پہلو سامنے آتا ہے ۔

' آج کے زمانے کے لئے اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں ' یہ کہنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ ہماری مستقبل کی ترقی کے لئے نشان ہدایت بن جاتی ہے ۔ تاہم یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ نشان ہدایت کی حیثیت خود اپنی نوعیت کے لحاظ سے عمومی اشارے کی ہوتی ہے ۔ وہ کوئی متعین تشریع نہیں ہے ۔ ہمارے سابقین اولین کی سنت جاریہ میں جہاں ہمیں قرآن کریم اور اعمال نبوی کی حقیقی اور کامیاب تعبیر و تشریح ملتی ہے جو امت کے دور اول میں ہوئی وہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ بعینہ اسی صورت میں اس کا اعادہ ناممکن ہے کیونکہ جہاں تک معاشروں اور ان کی ہیئت ترکیبی کا تعلق ہے تاریخ کبھی اپنے کو نہیں دہراتی۔ البتہ صرف ایک مفہوم میں قرون اولی کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمیں ترقی پذیر مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس مفہوم میں تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانا لابدی ہے وہ یہ کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانے کے حالات سے نمٹنے کے لئے پوری بصیرت کے ساتھ قرآن و سنت نبوی کی آزادانہ تعبیر کی اور اس ضمن میں انہوں نے اصل مقصد اور بنیادی اصولوں پر زور دیا، اور اپنے عہد کی تاریخ سے تازہ مواد لے کر عملی شکل دی، اسی طرح آج ہم اپنے اس زمانے میں خود اپنی کوششوں سے یہی کام سر انجام دیں ۔

ایک لحاظ سے مندرجہ ذیل مثالیں یونہی چن لی گئی ہیں ۔ یعنی یہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہماری کتابوں میں موجود ہیں ۔ لیکن یہ مثالیں ہمارا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے اور ہمارے دعوی کی تصدیق کے لئے کافی ہیں اور اتنی ہی

مؤثر ھیں جتنی کہ اور مثالیں ۔ ایک لحاظ سے ان مثالوں کا انتخاب ٹھیک بھی ہے کیونکہ ان کے انتخاب کی تہ میں ایک بڑی وجہ کار فرما تھی جسے محتاط قارئین بہت جلد سمجھ لیں گے ۔ یہ امر واقعہ ھے کہ بہت سی مثالیں حضرت عمر کی تشریعات اور فیصلوں سے لی گئی ھیں - اس کی وجہ سمجھنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں - حضرت عمر کے عہد میں دفعتہً وسیع فتوحات کی وجہ سے خود مدینہ میں اور مفتوحہ علاقوں میں اھم عمرانیاتی اور سیاسی مسائل پیدا ھوگئے ۔ عمرانیاتی لحاظ سے غالباً سب سے بڑا مسئلہ لونڈی غلاموں کی تعداد میں بے انتہا کثرت کا تھا - یہی عنصر جب آھستہ آھستہ آزاد ھوتا گیا تو یہ اتنا طاقت ور ھوگیا کہ بعد میں اسی نے اموی سلطنت کے خاتمے میں براہ راست حصہ لیا ۔ امام مالک کی الموطا کا مطالعہ کرتے وقت حضرت عمر کی تشریعات واقعی بہت متاثر کرتی ھیں خصوصاً غلاموں کے مسئلہ میں اور بالخصوص لونڈیوں کے مسئلے میں ان کی قانون سازی عظیم تاثر کی حامل ھے۔ چنانچہ اسی لئے مندرجہ ذیل مثالیں بیشتر الموطا سے لی گئی ھیں :

چند مثالیں

الف : قوانین جنگ

۱- محاربات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ رہا کہ اگر کوئی قبیلہ پرامن طریقے پر اطاعت نہ کرتا اور دوبدو جنگ میں شکست کے بعد ھتھیار ڈالتا تو اس کی زمین ضبط کرلی جاتی تھی ور مسلمان سپاھیوں میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم کردی جاتی تھی - قرین قیاس یہ ھے کہ یہ جنگی قانون قدیم سے چلا آرھا تھا، مسلمانوں نے اسے سنت نبوی کے طور پر اپنا لیا اور دشمن کی سرکوبی اور مسلمان سپاھیوں کی حوصلہ افزائی کے مقصد کے لئے بیرون عرب چھوٹی لڑائیوں کے دوران میں بھی اس قانون کو جنگی نظام میں شامل رکھا ۔ تاھم جب حضرت عمر رض کے زمانے میں ارض عراق و مصر مسلم سلطنت میں شامل ھوئی تو انہوں نے ان علاقوں کی مفتوحہ زمینوں کو عرب سپاھیوں کو عطا کرنے اور وھاں کے اصلی باشندوں سے لے لینے سے انکار

کردیا ۔ حضرت عمر رض اگرچہ اس موقف میں اکیلے نہیں تھے، جلیل القدر صحابہ آپ کے ہم نوا تھے لیکن اس کے باوجود انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور آخرکار یہ مخالفت اتنا زور پکڑ گئی کہ ایک بحران کی صورت پیدا ہوگئی ۔ لیکن حضرت عمر رض اپنے موقف پر قائم رہے ۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر عرب مجاہدین کاشتکار اور زمیندار ہوگئے تو وہ سپاہی نہیں رہیں گے ۔ درحقیقت ان کے موقف کی بنیاد — جیسا کہ بعد میں واضح ہوگیا۔ ان کی معاشرتی اور اقتصادی عدل کی بصیرت تھی ۔ ایک روز قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت حضرت عمر کے سامنے آئی ۔

> والذین جاء وا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ۔ ربنا انك رؤف رحیم (القرآن ۔ الحشر)
>
> '' اور جو لوگ ان کے بعد آئیں گے کہیں گے '' اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے میل نہ رکھ ' جو ایمان لے آئے ۔ اے رب تو رحیم اور مہربان ہے ۔
>
> (۱۰ : ۵۹)

یہ آیت عمومی انداز سے ان کے نظریہ کی تائید کرتی تھی اور وسیع تر مفہوم میں ان کے غیر متبدل نظریہ' عدل کی مؤید تھی ۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رض معاشرتی اقتصادی عدل کی بنیادی مقتضیات سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے زمینوں کو عرب مسلمان سپاہیوں میں یکے بعد دیگرے تقسیم کرنے سے انکار کردیا تھا اور اس طرح وہ عالمی آبادی اور آئندہ نسلوں کو نظر انداز کرنے پر تیار نہیں تھے ۔ (۲)

قرآن کریم اور سنت نبوی کی تعبیر و تشریح کے بارے میں اس واقعہ سے بعض انتہائی اہم امور کا بھی پتہ چلتا ہے یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے بعد مقبوضہ زمینوں کو ضبط کرلیا تھا ۔ تاریخی لحاظ سے یہ

۲ ۔ قاضی ابو یوسف' کتاب الخراج'' ۔ قاہرہ ۱۳۰۲ھ' ص ۲۰

واقعات اتنے واضح اور مسلم الثبوت ہیں کہ بعد کے اصولیین نے اسی قسم کے غیر مبہم احکام کے لئے محکم یا منصوص کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قرون اولی کے اس دور میں محکم متشابہ اور نص اور غیر نص کی کوئی نپی تلی تفریق موجود نہیں رہی۔ شاید اسی قسم کے واقعات سے ڈاکٹر جوزف شاخت جیسے محقق کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے اپنی کتاب Origius of Muhammadan Jurisprudence میں بار بار باصرار یہ کہا کہ "فقہ کے ارتقا کے اولین مراحل میں قرآن کریم کو نسبتاً ثانوی درجے میں متعارف کرایا گیا" (ص ۲۲۴)

اس کی بات خلاف واقعہ ہے لیکن اس سے ایک بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ قرون اولی کے لوگ ان چیزوں کے شدت سے پابند نہ تھے جن کو بعد میں نص یا متن کی عبارت کہا گیا ہے۔ حضرت عمر رض کا مذکورہ بالا واقعہ اس کی واضح مثال ہے۔ حضرت عمر رض اور ان کے ہم خیال صحابہ' اور جس پر بعد میں سب لوگ متفق ہوگئے' بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے کہ آنحضرت رض کو قبائل کے ایک مخصوص دائرے اور مخصوص فضا میں کام کرنا پڑا۔ اس لئے ان کے عمل کو ایسی جگہ بعینہ منطبق کرنا یقیناً سنت نبوی کی روح کے مخالف ہوگا جہاں وسیع علاقے اور پوری قومیں اس کی زد میں آتی ہوں ورنہ عدل کے اس اصول کی سرے سے مخالفت ہوگی جس کے لئے حضور ص ساری عمر لڑتے رہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ اگرچہ حضرت عمر رض ایک اہم معاملے میں بظاہر سنت نبوی کی ظاہری شکل سے ہٹ گئے لیکن در حقیقت ان کا یہ عمل خود سنت نبوی کی روح کے نفاذ کے لئے تھا۔ دیکھا جائے تو تاریخ میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو حضرت عمر رض کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو اتنے تخلیقی انداز اور اس قدر مؤثر اور پرحکمت انداز سے آگے لے کر چلے ہوں۔ لیکن ترک و اختیار کے یہ اصول اور فیصلے ایسے اقدامات ہیں جو ہر زندہ معاشرے کو ہمیشہ کرنے پڑتے ہیں خصوصاً ایسے مواقع پر کہ جب نئے عمرانی عناصر معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہوں۔

ب - قانون جرائم

۲- یہ مشہور و معروف واقعہ ھے کہ قحط کے زمانے میں حضرت عمر نے چوری پرسے قطع ید کی حد اٹھالی تھی -

ج - معاشرتی قانون سازی

۳- حضرت عمر نے حکم دیا کہ ' جس لونڈی سے بچہ پیدا ھو' اس کا آقا نہ اسے بیچ سکتا ھے نہ ھبہ کرسکتا ھے اور نہ ھی وراثت میں ترکہ کے طور پر منتقل ھو سکتی ھے - آقا کی زندگی میں (ماسوائے اس کے کہ آقا اسے آزاد کردے) وہ اس کی ملکیت ھوگی - لیکن اس کی وفات پر وہ خود بخود آزاد ھوجائے گی - (۳)

ھمیں معلوم ھے کہ جس لونڈی سے بچہ پیدا ھو' اور جسے اوائل اسلام میں " ام الولد " بھی کہا جاتا تھا - بیچی جاسکتی تھی ' ھبہ کی جاسکتی تھی - اور آقا کی وفات پر ترکے میں آتی تھی در حقیقت یہ عربوں کا قدیم رواج تھا جس سے حضور ص نے منع نہیں فرمایا کیونکہ ظاھر ھے یہ ابھی اتنا بڑا سماجی مسئلہ نہیں بنا تھا - ایک لحاظ سے لونڈی نے ابتدائے اسلام میں ھی خصوصی رعایت حاصل کرلی تھی - یہ رعایت ان اصلاحی تبدیلیوں سے الگ تھی جو قرآنی قوانین اور اخلاقی تہذیب کی بنیاد پر غلاموں کے معاملات میں عمومی طور پر وجود میں آئیں - لونڈی جب بچے کی ماں بن جاتی تو اسے " ام الولد " کہا جاتا تھا اور گویا اس طرح وہ خصوصی سلوک کی مستحق ھوجاتی - لیکن حضرت عمر کے عہد تک کوئی ایسا قانون نہیں بنایا گیا تھا جس کے تحت ام الولد کی خرید و فروخت اور ھبہ کی ممانعت ھو اور نہ ھی آقا کی وفات کے بعد اسے لونڈی کے طور پر رکھنے پر پابندی تھی- آقا کی وفات پر یقیناً ام الولد اور اس کے بچوں کو برابر کی آزادی ملنی چاھئے -

سوال یہ ھے کہ ایسے کون سے حقائق پیش آئے کہ ایسا رواج جو حضور ص کے زمانے سے چلا آرھا تھا بلکہ اسے سنت سکوتیہ کی تائید بھی حاصل تھی' اس کے خلاف قانون سازی کی جائے ؟ صریحاً بنیادی طور پر کسی اسلامی اصول پر

۳ - امام مالک' " المؤطا ' - قاھرہ ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۱ء) جلد دوم ص ۷۷۶

زد پڑ رہی تھی اور بدقت نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشرے میں بعض تازہ وارد عناصر کی وجہ سے معاشرتی عدل کا اہم ترین مسئلہ پیدا ہو رہا تھا ۔ لونڈی غلاموں کی کثرت سے بے شمار مسائل پیدا ہو رہے تھے ۔ سب سے زیادہ نازک مسئلہ ان لونڈیوں کا تھا ۔ جن کی بہت کثرت تھی اور جن کی اولاد تھی ۔ اگر پہلے کی طرح ان کی خرید و فروخت اور ھبہ کی اجازت دی جاتی تو اس کا معاشرے پر کیا اثر پڑتا؟ خصوصاً بچوں کا کیا ہوتا ان کی نفسیاتی اٹھان اور اخلاقی ساخت کس قدر متاثر ہوتی ۔ یہ تھیں وہ وجوہات جن کے پیش نظر حضرت عمر نے ان کی خرید و فروخت اور ھبہ کی ممانعت کردی اور قانوناً آقا کی وفات پر ان کی غلامی ختم ہونے کا اعلان کردیا ۔ جہاں تک آقا کی زندگی کا تعلق ہے، جب اس عورت سے اس کی اولاد پیدا ہوجاتی ہے تو یہ ماننا ضروری ہوجاتا ہے کہ طبعی ضرورت کی وجہ سے بھی آقا اس کی طرف بے حد توجہ دے رہا ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر رض نے آقاؤں کے حقوق پر پابندی عاید کردی یہاں تک کہ آپ نے ایک سنت کی ظاہری شکل کی مخالفت کی ۔ لیکن یہ مخالفت سنت کی روح کو زندہ اور مضبوط رکھنے اور اس کی نشو و نما اور ترقی کے لئے کی گئی ۔

حدیث کو روایتی طور پر مطالعہ کرنے والے طبقہ' یعنی علما کے لئے حضرت عمر کے یہ اقدامات بھی حدیث ہیں — یعنی حضرت عمر رض کے اقوال اور اعمال کی محض ایک خبر — جب تک حقیقی تاریخی واقعات کا تاریخی عمرانیاتی پس منظر میں اس طرح مطالعہ نہ کیا جائے کہ وہ ہمیں جیتی جاگتی حقیقتیں نظر آنے لگیں تو ایسا ہوگا گویا ہم کسی بے جان مواد کا مطالعہ کر رہے ہیں جو آج ہمارے لئے کوئی پیغام نہیں رکھتا ۔

کیا ہم علما سے یہ التماس کرسکتے ہیں کہ وہ احادیث کو ان کے ضروری اور متعلقہ پس منظر کے ساتھ مطالعہ کریں ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس طرح کی ایک بار کوشش کرلی گئی تو قرآن و سنت کی تعبیر کا سارا مسئلہ روایتی طریقے پر علوم دین کے طلبہ کے لئے کلیۃً نئے مفہوم کا حامل ہوگا ۔

(باقی آئندہ)